محمد طاسین

اسلامی ریاست کا اقتصادی پہلو

الحمد للّٰہ رب العلمین۔ والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء و خاتم
المرسلین' سیدنا محمد و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین

میں یہاں موضوع پر لکھنے سے پہلے چند اصولی باتوں کا ذکر ضروری جانتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ ایک اسلامی ریاست صرف وہ ریاست ہو سکتی ہے جس کی فکری بنیاد اسلام کے ایمانی عقائد اور عملی بنیاد اسلام کے تصور عدل و احسان پر قائم ہو۔ ایمانی عقائد میں اللہ کی ذات و صفات اور توحید کا عقیدہ ہے' دوسرا عقیدہ آخرت کے دن جزا و سزاء کا عقیدہ ہے' تیسرا عقیدہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری رسول اور آپؐ پر نازل شدہ قرآن مجید کے آخری سماوی کتاب ہونے کا عقیدہ ہے۔ اس فکری بنیاد کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ریاست اپنے شہریوں کے اقتصادی' سیاسی اور قانونی مسائل کے حل کے لیے اپنے پاس ایک ضابطہ و قانون بھی رکھتی ہو' جو عدل و احسان کی بنیادوں پر تیار کیا گیا ہو۔ ایسی ریاست ہی عملی طور پر اسلامی ریاست کہلانے کی حقدار ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی ریاست کا اسلامی یا غیر اسلامی ہونا' اس کے شہریوں اور باشندوں کے اعتقاد و عمل کے لحاظ سے ہوتا ہے' اگر ان کے عقائد

و اعمال اسلامی ہیں تو وہ ریاست اسلامی اور غیر اسلامی ہیں تو وہ غیر اسلامی ہے' ریاست کے آئین میں صرف یہ لکھ دینا کہ حاکمیت اللہ کی ہے اور جملہ قوانین کتاب و سنت اور قرآن و حدیث کے مطابق ہوں گے' اس ریاست کو اسلامی نہیں بنا دیتے' اسلام اور کفر کا تعلق زندہ مکلف انسانوں سے ہے جو اختیار رکھنے کی بنا پر آخرت میں ثواب و عذاب کے سزاوار قرار پاتے ہیں' ریاست نام کے کسی ذہنی تصور سے کفر و اسلام کا کوئی تعلق نہیں جو نہ صاحب عقل و اختیار ہے اور نہ قابل جزاء و سزا' للذا یہ بات سراسر غلط ہے کہ شہریوں سے الگ تھلگ ریاست کا بھی خارج میں کوئی وجود ہے جو اسلام اور کفر سے متصف ہو سکتا ہے۔

دوسری اصولی بات یہ ہے کہ ریاست کے اندر حکومت کے نام سے ایک طاقتور ادارے کا وجود ضروری ہوتا ہے' اسلام کے نزدیک اس کے وجود کا مقصد' طاقت کے ذریعے ایسے احکام و قوانین کا نفاذ ہے جس سے ریاست کے سب شہریوں کے مکمل حقوق کا تحفظ اور عدل کا قیام عمل میں آتا ہو جس کا لازمی نتیجہ اجتماعی امن و امان کی صورت میں سامنے آتا ہے' جس کی خاطر حکومت معرض وجود میں آتی ہے۔

یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اسلام کے نزدیک حکومت کا قیام بذات خود مقصود نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کا ذریعہ اور وسیلہ ہونے کی وجہ سے مقصود بالغیر ہے اور وہ ہے ریاست کے تمام باشندوں کے حقوق کا تحفظ اور اجتماعی امن و امان کا قیام۔ چونکہ ذریعہ اور وسیلہ وہی صحیح اور عمدہ ہوتا ہے جو حصول مقصد میں مددگار ثابت ہوتا ہو۔ للذا حکومت کی وہی شکل صحیح اور اچھی قرار پاتی ہے جس سے ریاست کے تمام شہریوں کے حقوق کا تحفظ' عدل کا قیام اور اجتماعی امن و امان وجود میں آتا ہو' اس کے برعکس حکمت کی ہر وہ شکل غلط اور بری قرار پاتی ہے جو حصول مقصد میں ناکام ثابت ہوتی ہو' یاد رہے کہ حکومت کی کوئی ایک

متعین شکل مختلف قسم کے ذہنی و خارجی حالات رکھنے والے معاشروں میں یکساں طور پر مفید و کامیاب نہیں ہوتی بلکہ مختلف حالات رکھنے والے معاشروں میں حکومت کی مختلف شکلیں مفید و کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ لہٰذا اسلام مختلف ممالک اور مختلف معاشروں کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ ضروری نہیں ٹھہراتا کہ وہ سب حکومت کی کسی ایک متعین شکل اختیار کریں بلکہ مختلف معاشروں کے لیے مختلف قابل قبول اور قابل عمل شکلیں جائز قرار دیتا ہے بشرطیکہ ان سے لوگوں کے حقوق کا تحفظ اور اجتماعی امن و امان قائم ہوتا ہو۔ چنانچہ جو حکومت اپنے اس مقصد میں ناکام ہو' نہ اس کی موجودگی میں سب لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں اور نہ اجتماعی امن و امان قائم ہو اسلام کے نزدیک ایسی حکومت غلط اور ناجائز قرار پاتی ہے۔ اسلام حکومت کے قیام سے پہلے' صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کے افراد کی فکری اور عملی اصلاح پر زور دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی عظیم اکثریت ایسی ہو جائے کہ وہ بغیر کسی بیرونی دباؤ اور خوف و جبر کے محض اپنی داخلی تحریک سے ایسے قوانین کی پابندی کرنے لگے جن کی عملی پابندی سے سب کے حقوق کا تحفظ اور امن و امان وجود میں آتا ہے' اور ظاہر ہے کہ جب معاشرے کی عظیم اکثریت فکر و عمل کے اعتبار سے صحت مند ہوگی تو اس میں جو حکومت تشکیل پائے گی' وہ اپنے مقصد کو بروئے کار لانے میں ضرور کامیاب ہوگی۔

تیسری اصولی بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں اسلام کی جو معاشی تعلیمات ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے کے ہر فرد اور ریاست کے ہر شہری کو گرچہ سادہ سے سادہ شکل میں اور معمولی سے معمولی معیار پر سہی' کھانے پینے کے لیے غذا' پہننے کے لیے لباس اور رہنے کے لیے گھر اور ایک حد تک تعلیم کی سہولتیں ہر حال میں ضرور میسر ہوں' نیز ہر فرد کو معاشی ترقی یعنی اپنی ضرورت سے زائد رزق و مال اور سامان معاش کمانے کا موقع حاصل ہو۔

بے شبہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آخرت کی جنت سے پہلے اس دنیا میں بھی ہر انسان کو اپنی طبعی عمر تک پائدار امن و اطمینان اور مستقل سکھ و چین کی خوشگوار زندگی نصیب ہو جس کی ہر انسان فطری طور پر خواہش رکھتا ہے۔ لیکن جس معاشرے میں بعض افراد بنیادی معاشی ضروریات سے محروم ہوں' ان کو کسی شکل میں بھی غذا' لباس' مکان میسر نہ ہو اور دوسرے افراد کو بہتات و فراوانی کے ساتھ وہ بنیادی معاشی ضروریات بہتر سے بہتر شکل میں میسر ہوں۔ یا جس معاشرے میں بنیادی معاشی ضروریات تو کسی نہ کسی شکل میں سب افراد کو میسر ہوں لیکن معاشی ترقی کے مواقع صرف بعض افراد کو حاصل ہوں یعنی بعض افراد پر ضرورت سے زائد مال و دولت کمانے کے راستے کھلے ہوئے ہوں' اور ان کے مقابلے میں دوسرے بعض افراد پر ضرورت سے زیادہ مال و دولت کما سکنے کے راستے مسدود اور بند ہوں جس کی بڑی وجہ اول الذکر افراد کی ملکی وسائل دولت اور مواقع کار پر اجارہ داری ہوا کرتی ہے' بہرحال دونوں صورتوں میں ایسے معاشرے کے اندر دیر سویر سے ایسے حالات رونما ہو کر رہتے ہیں جن سے عام بدامنی و بے چینی پھیلتی اور معاشرہ تباہی و بربادی سے دوچار ہو کر رہتا ہے' چنانچہ اسلام ایک پائدار امن اور رفاہیت و خوشحالی کی خاطر ضروری قرار دیتا ہے کہ معاشرے کے ہر فرد اور ریاست کے ہر شہری کو کسی نہ کسی درجے میں بنیادی معاشی ضروریات ہمیشہ میسر ہوں اور اس کو معاشی ترقی یعنی زائد از ضرورت رزق و مال کما سکنے کا موقع بھی حاصل ہو' اسی مقصد کے پیش نظر اسلام نے ایسے اصول تجویز کئے ہیں جن پر عمل کرنے سے مذکورہ مقصد بخوبی حاصل ہو سکتا ہے اور ایک متوازن و معتدل معاشی ماحول وجود میں آجاتا ہے جس کے اندر ہر ایک کو معاشی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ریاست کے ہر فرد و بشر کے معاشی تحفظ کے لیے کہا گیا ہے کہ کائنات میں حیوانات' نباتات اور جمادات

وغیرہ کی شکل میں جو قدرتی وسائل رزق اور اسباب معاش ہیں یہ سب بنی نوع انسان کے انتفاع و استفادہ کے لیے ہیں لہٰذا ان سے رزق اور سامان معاش حاصل کرنا سب انسانوں کا یکساں طور پر حق ہے' کوئی انسان دوسرے انسان کو اس حق سے محروم نہیں کرسکتا اگر کرتا ہے تو وہ ظلم و تعدی کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں رزق و مال ایک ایسی چیز ہے جس کے بغیر انسان اپنی طبعی عمر تک سکون و اطمینان کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اللہ نے ایک طرف کائنات میں وہ جملہ اشیاء پیدا فرمائیں جن سے انسان کو رزق اور سامان معاش مل سکتا تھا اور دوسری طرف انسان کو وہ تمام فکری اور عملی صلاحیتیں اور قوتیں عطا فرمائیں جن کے ذریعے وہ قدرتی اشیاء اور وسائل رزق و مال سے اپنے لیے رزق اور سامان معاش حاصل کرسکتا تھا اور پھر یہ لازم ٹھہرایا کہ جو انسان کسب معاش اور حصول رزق کے سلسلہ میں کوئی کام کرسکتا ہو ضرور کرے تاکہ منشاء الٰہی پورا ہو اور معاشرے کو فائدہ پہنچے' نیز یہ کہ ہر آدمی کا یہ بنیادی حق ہے کہ اسے معاشرے میں آزاد مواقع حاصل ہوں۔ چنانچہ حکومت ہر وہ اقدام اور تصرف کرسکتی ہے جس سے لوگوں کے لیے اس حق کا تحفظ ہوسکتا ہو۔ مثلاً اگر کبھی صورت حال ایسی ہو کہ ملک کے اندر کام کرنے کی صلاحیت اور چاہت رکھنے والے افراد کی تعداد دس لاکھ ہو اور ان میں سے پانچ لاکھ کو روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرنے اور سو روپے کمانے کا موقع حاصل ہو اور دوسرے پانچ لاکھ کو ایک گھنٹے کام کرنے اور یومیہ بیس پچیس روپے کمانے کا بھی موقع حاصل نہ ہو تو ایسی صورت حال میں حکومت بجا طور پر یہ کرسکتی ہے کہ اول الذکر پانچ لاکھ افراد کے اوقات کار کو آٹھ گھنٹے سے گھٹا کر چار گھنٹے روزانہ کردے اور بقیہ چار گھنٹوں میں ان دوسرے بے روزگار پانچ لاکھ افراد کو کام کار کرنے کا موقع مہیا کرے تاکہ سب افراد روزانہ چار گھنٹے

کام کر کے پچاس روپے یومیہ کما سکیں اور ہر ایک اپنی معاش کا بوجھ خود اٹھائے' سوائے ایسے افراد کے جو کسی عذر مثلاً بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے خود کام کرنے اور کمانے کے قابل نہ ہوں۔ اسلام کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ کام کار کرنے کے قابل تندرست و توانا افراد دوسرے لوگوں پر بوجھ بنیں' اسی طرح اسلام کی رو سے یہ بھی جائز نہیں کہ حکومت کام کرنے والوں پر ٹیکس لگا کر اس کی آمدنی سے بے روزگار لوگوں کو مستقل طور پر معاشی سہارہ دے۔ ایسی صورت میں مسئلہ بے روزگاری کا حل اسلام کے نزدیک یہ ہے کہ حکومت ایسے شہریوں کے لیے مواقع کار مہیا کرے جو کام کار کرنے کے قابل اور ضرورت مند ہوں' ایسا کرنا اس کے لیے اسلامی عدل کا تقاضا ہے۔

اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں سے دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر کام و محنت کا معاوضہ محنت کی نوعیت اور مقدار کے مطابق ہونا ضروری ہے جیسا اور جتنا کسی کا کام و عمل ہو اس کے مطابق اس کا صلہ اور معاوضہ ہونا چاہیے۔ گویا اسلام اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ سب معاشی کام یکساں نوعیت کے نہیں ہوتے بلکہ ان کے درمیان نوعیت کے لحاظ سے نمایاں فرق و اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض ماہرین فن نے لکھا ہے کہ ایک گھنٹے کی دماغی محنت میں جو توانائی خرچ ہوتی ہے وہ اس توانائی کے برابر ہوتی ہے جو دس گھنٹے کی جسمانی محنت میں صرف ہوتی ہے' اسی طرح صرف ہونے والی توانائی کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف دماغی محنتوں کے مابین بھی فرق ہوتا ہے' جس طرح مختلف جسمانی محنتوں کے درمیان فرق ہوتا ہے' اس فرق کا اظہار بعض دفعہ اس تھکان اور کمزوری سے بھی ہوتا ہے جو کام محنت کرنے والے کے دماغ اور بدن پر طاری ہوتی ہے' دوسری چیز جس کے اعتبار سے مختلف کاموں کی نوعیت ایک دوسرے سے متفاوت ہوتی ہے۔ مثلاً بعض محنتوں پر مرتب ہونے والا فائدہ فرد کی ذات تک یا ایک خاندان تک محدود ہوتا اور بعض کا فائدہ جماعت' قوم اور

انسانیت تک وسیع ہوتا ہے' بعض کاموں کا فائدہ زندگی کے کسی ایک پہلو سے تعلق رکھتا اور بعض کا فائدہ متعدد پہلوؤں سے مربوط ہوتا ہے' اسی طرح بعض کاموں کا فائدہ وقتی اور عارضی اور بعض کا دائمی پائدار اور مستقل ہوتا ہے' بہرحال یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مرتب ہونے والے فائدے اور افادیت کے لحاظ سے سب معاشی کام برابر اور یکساں نہیں ہوتے' کون نہیں جانتا کہ افادیت کے اعتبار سے ایک بے ہنر مزدور کی محنت ایک ماہر کاریگر کی محنت کے برابر نہیں ہوتی' کھیت میں کام کرنے والے ایک کسان اور لیبارٹری میں ریسرچ کرنے والے ایک سائنس دان کی محنت کے درمیان جو فرق ہے' اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور' اور ہوائی جہاز کے پائلٹ کی محنت' ایک پرائمری ٹیچر اور ایک یونیورسٹی پروفیسر کی محنت' ایک چپڑاسی اور کلرک اور ایک کارخانہ مینجر کی محنت' فوج کے عام سپاہی اور کمانڈر' عدالت کے ایک پیش کار اور جج کی محنت افادیت اور اپنے مفید اثرات و نتائج کے لحاظ سے برابر ہوتی ہے۔ پھر جب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے تو پھر یہ ماننا ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے معاوضوں کے درمیان کمی بیشی کے لحاظ سے فرق ہونا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ایک حقیقت پسند اور عادلانہ دین ہے' اس لیے ضروری ہے کہ ہر معاشی کام کرنے والے کے کام کا معاوضہ اس کے کام کی نوعیت اور مقدار کے مطابق ہو' البتہ یہ نہایت ضروری ہے کہ جو معاشی کام و عمل نوعیت کے لحاظ سے ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کا ہو اس کی بھی یومیہ مقدار مثلاً سات آٹھ گھنٹے کا معاوضہ اتنا ضرور مقرر کیا جائے جس سے کام کرنے والے کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں جن کے بغیر عام طور پر ایک انسان اپنی طبعی عمر تک سکون و اطمینان کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ اپنے متعلقہ فرائض و وظائف کو ٹھیک طور پر ادا کر سکتا ہے۔

اسلام کے نزدیک ہر معاشی کام کرنے والے کا یہ معاشی حق ہے کہ

اس کے کام کا معاوضہ اس کو کام کی نوعیت اور مقدار کے مطابق ملے لہٰذا اس معاشی حق کے تحفظ کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ اس بارے میں معلومات حاصل کرے کہ معاشی کام کرنے والے افراد کو جو معاوضے مل رہے ہیں' وہ اسلام کے مذکورہ معاشی اصول کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اگر کہیں وہ یہ دیکھے کہ کچھ لوگوں کو ان کے کام کا معاوضہ اتنا نہیں مل رہا جو ان کی بنیادی ضروریات کے لیے کافی ہو سکتا ہو تو ان کے معاوضے میں مناسب اضافے کا حکم دینا اس پر لازم ہے' اسی طرح اگر اس کے علم میں یہ بات آئے کہ دو کام کرنے والوں کے کام کی نوعیت اور مقدار بالکل یکساں و برابر ہے لیکن ان کے معاوضوں میں کمی بیشی کے لحاظ سے فرق ہے تو اس کے لیے ایسا حکم جاری کرنا ضروری ہوتا ہے جس سے ان کے معاوضوں میں مساوات و برابری پیدا ہو' کیونکہ اسلام انسانوں کے درمیان جس مساوات و برابری کا علمبردار ہے اس کے عملی مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ جب دو انسانوں کا کام و عمل نوعیت اور مقدار کے لحاظ سے مساوی اور برابر ہو تو ان کا معاوضہ بھی مساوی و برابر ہو۔

یہاں یہ بات محتاج بیان نہیں کہ اسلام اور افراد معاشرہ کے درمیان جس معاشی مساوات کا قائل ہے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ سب افراد کے پاس رزق و مال مساوی اور برابر ہو جتنا اور جیسا رزق و مال اور معاشی سرو سامان ایک کے پاس ہو اتنا اور ویسا ہی ہر دوسرے فرد کے پاس بھی ہو کیونکہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ افراد معاشرہ کے درمیان رزق و مال میں تفاوت اور کمی بیشی کا ہونا' منشاء الٰہی کے مطابق اور جائز ہے کیونکہ اس سے معاشرے کی بہت سی مصلحتیں اور افراد کی بکثرت منفعتیں وابستہ ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ قرآن مجید جس چیز کی مذمت کرتا اور اس سے روکتا ہے وہ یہ بات نہیں کہ بعض افراد کے پاس رزق و مال زیادہ ہے

اور بعض کے پاس کم بلکہ وہ اس امر سے روکتا ہے کہ زیادہ مال و دولت والے اپنی دولت مندی کا مظاہرہ کرنے اور دوسروں پر اپنی فوقیت و برتری جتلانے کے لیے اپنے رہن سہن اور بود و باش کا ایسا مسرفانہ معیار زندگی اختیار نہ کریں' جسے معاشرے کی عظیم اکثریت اختیار نہ کرسکتی ہو کیونکہ یہ طرز عمل اور طور طریقے معاشرے کی تباہی و بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ افراد معاشرہ کے درمیان معیار زیست یعنی خوراک' پوشاک اور جائے رہائش وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ مساوات و برابری ہو تاکہ اجتماعی توازن قائم رہے اور سب کو پائدار سکون و اطمینان نصیب ہو' اسلام زیادہ مال و دولت رکھنے والوں کو تعلیم اور ترغیب دیتا ہے کہ وہ ضرورت سے زائد مال راہِ خدا میں خرچ کرکے خدا اور خلق خدا کی رضا و خوشنودی حاصل کریں اور دنیا و آخرت دونوں جہان کی فوز و فلاح کے مستحق بنیں۔

اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں ایک اصول جس کا تعلق حق ملکیت سے ہے' یہ ہے کہ خالق کائنات کی پیدا کردہ قدرتی اشیاء بنی نوع انسان کے استفادے کے لیے قدرت کا عطیہ عام ہوتی ہیں اور بلا کسی تخصیص اور امتیاز ہر انسان اس سے فائدہ اٹھانے کا یکساں حق رکھتا ہے گویا وہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہوتیں کیونکہ ملکیت کے معنے ہیں کسی شخص کو کسی شے سے استفادے کے حق میں دوسروں پر ترجیح حاصل ہونا۔ یہ ملکیت کسی ایسی شے کے متعلق کسی انسان کو حاصل نہیں ہوسکتی جو اب تک اپنی قدرتی حالت پر برقرار ہو اور کسی انسان کے تصرف سے اس میں کوئی مفید تغیر و تبدل نہ ہوا ہو۔

کسی شے کی شخصی ملکیت کے متعلق اسلامی اصول یہ ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں سے سبقت کرکے کسی قدرتی شے میں ایسا تصرف اور ردوبدل کرتا ہے جس سے اس شے کی قدرتی افادیت میں ایک نئی افادیت کا اضافہ ہو

جاتا ہے تو وہ شے اس شخص کی ملکیت ہو جاتی ہے یعنی اس کو اس شے سے فائدہ اٹھانے کے حق میں باقی اشخاص پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب اس کی اجازت کے بغیر دوسرا کوئی شخص اس شے سے استفادہ نہیں کرسکتا' اور اس ملکیت اور حق انتفاع میں ترجیح کا سبب وہ مفید اثرات ہوتے ہیں جو اس شخص کی سعی و عمل سے وجود میں آکر تغیرو تبدل کی صورت میں اس شے کے ساتھ قائم ہوگئے ہوتے ہیں۔ اور اس کا فلسفہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی آیت لیس للانسان الا ماسعٰی کی رو سے ہر انسان اپنی سعی و کوشش کے مفید اثرات سے فائدہ اٹھانے کا خود حقدار ہے بالفاظ دیگر ہر انسان کی سعی کے مفید اثرات اسی کے فائدہ کے لیے مخصوص ہیں۔

البتہ کسی شخص کو کسی شے سے متعلق جو حق ملکیت حاصل ہوتا ہے وہ ناقابل انتقال نہیں بلکہ قابل انتقال ہوتا ہے' اسلام اس کو تسلیم کرتا اور بتلاتا ہے کہ لین دین اور مبادلے کے وہ کون کون سے طریقے ہیں جن کے ذریعے کسی شے سے متعلق ایک شخص کا حق ملکیت دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور پہلے شخص کی بجائے یہ دوسرا اس شے کا مالک قرار پاتا ہے چنانچہ اس کی رضامندی کے بغیر دوسرا کوئی اس سے مالکانہ تصرف اور استفادہ نہیں کرسکتا۔

اسلام کا یہ ایک بنیادی معاشی اصول ہے کہ کوئی شخص دوسرے شخص کے کسی مال کا مالک نہیں ہوسکتا سوائے کسی ایسے طریقہ کے کہ جس میں پہلے مالک کی رضا مندی پائی جاتی ہو' لہٰذا شریعت اسلامی نے تبادلے اور لین دین اور دوسرے کا مال لینے کے ایسے سب طریقوں کو جائز قرار دیا ہے جن میں پہلے مالک کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے۔

تبادلے کے وہ معاملات جن کے اندر ہر فریق کی حقیقی رضا مندی موجود ہوا کرتی ہے اور جن کے ذریعے ایک فریق کی مملوکہ چیز دوسرے فریق کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے' اسلام کے نزدیک عام حالات میں تین ہیں'

اول بیع و شراء کا معاملہ 'دوم قرض کا معاملہ اور سوم اجارے بہ معنی اجرت پر کام کرنے کا معاملہ' اور جن معاملات میں تبادلہ نہیں ہوتا اور ان کے ذریعے ایک کی دی ہوئی چیز دوسرے کی ملکیت قرار پاتی ہے' اسلام کی رو سے یہ ہیں' وصیت' وراثت کا معاملہ جس میں ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی متروکہ چیز ورثاء کو اور اس شخص کو ملتی ہے جس کے لیے مرنے والے نے وصیت کی تھی چونکہ وراثت اور وصیت میں بھی پہلے مالک کی رضامندی موجود ہوتی ہے' لہٰذا اس کی مملوکہ چیز دوسرے کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے' نیز صدقے' عطیے اور ھدیے کا معاملہ جس میں اخروی اجر و ثواب اور اللہ کی خوشنودی کی غرض سے ایک مالک اپنی مملوکہ چیز دوسرے کو تبرعاً" دے دیتا ہے' چونکہ وہ اپنی مرضی خوشی سے دیتا ہے' لہٰذا دوسرے کو اس چیز کے متعلق حق ملکیت حاصل ہو جاتا ہے۔

مذکورہ معاملات اور طریقوں کے علاوہ اگر کسی اور طریق سے دوسرے کی مملوکہ چیز پر قبضہ کیا جائے تو وہ اس وجہ سے حرام و ناجائز قرار پاتا ہے کہ اس میں اصل مالک کی حقیقی رضامندی موجود نہیں ہوتی جیسے ربا' قمار' چوری' غصب' خیانت' دھوکہ دہی وغیرہ۔

حق ملکیت کے تحفظ کی ذمہ داری بھی اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے اور اس تحفظ کے سلسلے میں اس کا فرض ہے کہ وہ خاص طور پر اراضی سے متعلق شخصی ملکیتوں کا سروے کرائے اور تحقیقی جائزہ لے کر دیکھے کہ وہ اسلام کے مذکورہ تصور ملکیت کے مطابق ہیں یا نہیں' جو مطابق ہوں برقرار رکھے اور جو مطابق نہ ہوں ان کو جبراً" ختم اور کالعدم قرار دے دے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں جاگیرداری اور زمینداری نظام موجود ہے' ایسا کرنا قومی و اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہاں ہزارہا ایکڑ اراضی ایسی ہیں جن کے مالک ایسے اشخاص بنے بیٹھے ہیں جو اسلامی قانون ملکیت کی رو سے ان کے مالک

نہیں۔ ہزارہا ایکڑ قطعات اراضی ایسے ہیں جو زمانہ دراز سے اپنی قدرتی حالت میں غیر آباد پڑے ہیں لیکن کچھ لوگ ان پر مالکانہ قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ نہ خود آباد کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دیتے ہیں اور ان کو اس طرح بیچتے اور فروخت کرتے ہیں جس طرح کوئی مالک اپنی مملوکہ چیز کو بیچتا اور فروخت کرتا ہے' حالانکہ اسلام کی رو سے ان کو یہ حق حاصل نہیں۔ اسلام کی رو سے کوئی شخص ذاتی حالت پر پڑی ہوئی غیر آباد زمین کا اس وقت مالک قرار پاتا ہے جب وہ محنت مشقت کر کے اس کو آباد کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث اس طرح ہے۔ "من احیٰی ارضا" میۃ فھی لہ" جس نے کسی مردہ غیر آباد زمین کو زندہ و آباد کیا وہ اس کی اور اس کے ذاتی استفادہ کے لیے مخصوص ہے۔ مطلب یہ کہ کسی قدرتی حالت پر پڑی بنجر زمین کا محض قبضہ کرنے اور اس کے اردگرد نشانات لگا دینے سے کوئی شخص اس کا مالک نہیں بن جاتا' قبضہ اس کو صرف حق آباد کاری حاصل ہوتا ہے' اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو تین سال گزرنے پر خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اب دوسرا جو بھی اس کو آباد کرے وہ اس کا مالک قرار پاتا ہے۔ غرضیکہ ایسی اراضی پر مذکورہ لوگوں کا مالکانہ قبضہ شرعا" ناجائز ہے۔ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ بہ زور ایسی اراضی پر مذکورہ لوگوں کا قبضہ ختم کرے اور ان کو ہرگز کوئی معاوضہ نہ دے اور پھر ایسی اراضی ایسے لوگوں میں مفت تقسیم کرے جو اس کو آباد کرنا چاہتے ہوں۔ اسی طرح یہاں لاکھوں ایکڑ اراضی ایسی بھی ہیں جو قابل کاشت اور آباد ہیں لیکن ان کے مالک وہ لوگ نہیں' جنہوں نے خود یا ان کے آباء و اجداد نے ان اراضی کو آباد کیا ہے اور پھر پشت در پشت ان کو آباد کرتے چلے آرہے ہیں اور موروثی کاشتکار کہلاتے ہیں بلکہ ان کے مالک وہ لوگ بنے ہوئے ہیں جنہوں نے نہ خود اور نہ ان کے آباء واجداد نے ان کو آباد کیا اور نہ آباد کرنے والوں کو باقاعدہ معاوضہ دے کر خریدا بلکہ ان کے آباء واجداد نے ظلم و

جبر کے ذریعے غاصبانہ طور پر خود کو ان اراضی کا مالک قرار دیا اور اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر حکومت وقت سے اپنی مالکانہ حیثیت تسلیم کروالی، مطلب یہ کہ اسلامی قانون ملکیت کی رو سے وہ لوگ مذکورہ اراضی کے مالک نہیں بلکہ ان کے مالک وہ کاشتکار ہیں جو پشت در پشت ان کو کاشت کرتے چلے آرہے ہیں، چنانچہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مذکورہ افراد کی ملکیت کو کالعدم قرار دے کر بلا کسی معاوضہ کے مزارعین کو ان کا مالک تسلیم کرے اور ان کو مالکانہ قانونی تحفظ دے، اس سے ملکی معیشت میں خوشگوار انقلاب آنا ایک قدرتی امر ہے۔

معاشی معاملات کے درست و نادرست اور جائز و ناجائز کے متعلق اسلام کا اصولی تصور یہ ہے کہ جن کاروباری معاملات میں ہر فریق کو اس کی چیز کا پورا عوض ملتا ہے اور وہ پورے عوض کی بنا پر دوسرے کی چیز کا حقدار ٹھہرتا ہو، ایسے معاملات عدل اور دونوں فریق کی رضا مندی کی وجہ سے درست و جائز ہوتے ہیں، اور جن معاشی معاملات میں کوئی فریق بغیر صحیح عوض کے دوسرے کی چیز کا مستحق بنتا ہو ایسے معاملات ظلم و حق تلفی پر مبنی اور ایک فریق کی حقیقی رضا مندی کے غیر موجود ہونے کی وجہ سے نادرست و ناجائز ہوتے ہیں۔ چونکہ بیع و شراء کے تجارتی معاملات میں جب وہ دیانتدارانہ ہوں، ہر فریق کو اس کے مال کا رواج کے مطابق پورا معاوضہ ملتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے ان کو حلال و جائز بتلایا ہے، اس کے بالمقابل ربا میں چونکہ ایک فریق اپنے قرض پر دیئے ہوئے مال پر مزید لیتا ہے جسے مقروض مجبوراً ادا کرتا ہے اس لیے ربا اور ربا کی طرح کے معاملات کو قرآن حکیم نے حرام و ممنوع بتلایا ہے۔ ان معاملات میں سرفہرست مزارعت و مخابرت یعنی بٹائی کا معاملہ آتا ہے۔ بعض احادیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ربا سے تعبیر فرمایا اور اس سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ مزارعت و مخابرت سے مراد وہ

معاملہ ہے جو مالک زمین اور کاشتکار کے مابین اس طرح طے پاتا ہے کہ کاشتکار کاشت کے سلسلے میں اپنی محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ بیج' کھاد' بیل وغیرہ کے اخراجات بھی خود برداشت کرے گا اور اس سے جو پیداوار حاصل ہوگی اس میں سے ایک حصہ مالک زمین کا اور ایک کسان کا ہوگا۔ اس معاملے کی ربا کے معاملے سے جو مشابہت ہے وہ یہ کہ جس طرح ربا میں قرض کا اصل مال سود خور کے حق میں محفوظ رہتا ہے اور معاملہ ختم ہونے پر اس کو پورے کا پورا مل جاتا ہے اور اس پر بطور سود جو زائد مال لیا جاتا ہے اس کے عوض اس کی طرف سے نہ کوئی مال ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی پیداواری کام و عمل' لہٰذا وہ دوسرے کا مال بلا عوض کے ناحق لیتا ہے اور یہ حرام ہے۔ اسی طرح مزارعت میں زمین مالک کے حق میں محفوظ رہتی ہے اور معاملہ ختم ہونے پر اسکو پوری کی پوری واپس مل جاتی ہے۔ کاشت کرنے سے جبکہ اس میں کھاد وغیرہ بھی ڈالی جاتی ہے۔ اس کی مالیت اور قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ بنجر و غیر آباد زمین کے مقابلے میں زیر کاشت زمین کی قیمت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے بہرحال یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ محض کاشت کرنے سے زمین کی مالیت کم نہیں ہوتی۔ اس کی کمی سے مطلب یہ کہ زمین کا مالک کاشتکار سے پیداوار کا جو حصہ لیتا ہے' بلاعوض اور ناحق لیتا ہے۔ چنانچہ ربا کے حرام ہونے کی اصل وجہ اس میں بھی پائی جاتی ہے۔ غالباً اسی مشابہت کی وجہ سے اس کاشت کاری کو مجازاً" ربا فرمایا گیا ہے۔ سنن ابی داؤد میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا مضمون اس طرح ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہؓ کرام کے ساتھ ایک راستہ سے گزر رہے تھے کہ آپؐ کی نظر راستے کے کنارے ایک لہلہاتے کھیت پر پڑی آپؐ نے صحابہ سے پوچھا یہ کس کا کھیت ہے' بتلایا گیا کہ رافع بن خدیج کا جو اس وقت کچھ دور کھیت کو پانی دینے میں مشغول تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا اور پوچھا یہ کس کا کھیت

ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ یہ زمین فلاں کی ہے اور اس میں جو کھیتی اور فصل ہے میرے بیج اور محنت و مشقت کا نتیجہ ہے اور زمین والے سے طے یہ پایا ہے کہ نصف پیداوار اس کے لیے اور نصف میرے لیے ہوئی اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اربیتما" تم دونوں ربا میں مبتلا ہو لہٰذا اس معاملہ کو ختم کرو، زمین اس کے مالک کو دے دو اور اس سے اپنا خرچہ لے لو۔

مستدرک حاکم میں حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ایک حدیث کا مضمون اس طرح ہے کہ جب سورۂ بقرہ کی آیات ربا نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من لم یذر المخابرہ فلیوذن بحرب من اللّٰہ و رسولہ ترجمہ جو شخص مخابرہ کاشت کے معاملہ کو نہ چھوڑے اس کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ یہ الفاظ بعینہ وہی ہیں جو سورہ بقرہ کی آیات ربا میں ربا کو نہ چھوڑنے والوں کے متعلق فرمائے گئے ہیں: فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللّٰہ و رسولہ پس اگر تم ربا کو نہ چھوڑو تو اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

صحاح ستہ کی ایک حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا جس کے پاس زمین ہو وہ اس کو خود کاشت کرے اور کسی وجہ سے خود کاشت نہ کرسکتا ہو تو اپنے بھائی کو مفت کاشت کے لیے دے دے اور یہ بھی نہ کرسکتا ہو تو پھر اس کو یونہی بیکار چھوڑ دے۔ پیداوار کا ایک حصہ لینے کے لیے کسی کو کاشت کے لیے نہ دے۔

ان مذکورہ احادیث اور بہت سی دوسری احادیث کے پیش نظر امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ مزارعت و مخابرت کا یہ معاملہ شرعاً" ایک فاسد، باطل اور ناجائز معاملہ ہے۔ امام احمد بن حنبل کے نزدیک بھی اس معاملہ کی یہ شکل جس میں تخم و بیج بھی کاشتکار کی طرف سے ہو، فاسد اور ناجائز ہے۔ لہٰذا اس کے عدم جواز پر تقریباً چاروں آئمہ کرام کا اتفاق ہے۔

مسئلہ سے متعلق کسی کو شرح و بسط کے ساتھ تفصیلی بحث دیکھنی ہو تو میری کتاب "مروجہ نظام زمینداری اور اسلام" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ بعض مسلم ممالک جیسے مصر، شام اور سوڈان وغیرہ میں مزارعت کے اس معاملہ کو قانونی طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے، وہاں کے علماء کرام نے نہ صرف یہ کہ اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کی حمایت کی اور حکومتوں کے اس اقدام کو اسلام کے مطابق بتلایا ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں کاشتکار ہی اپنی زیر کاشت زمین کے مالک ہیں، اور زمینداری نظام ختم ہو گیا ہے۔ کاش پاکستان میں بھی ایسا ہی ہو اور جاگیرداری اور زمینداری نظام کی گوناگوں برائیوں سے اس ملک کو چھٹکارا ملے۔

بہرحال معاشی اور اقتصادی پہلو سے ایک اسلامی ریاست کے لیے بیحد ضروری ہے کہ اس کے اندر ربا اور ایسے تمام معاشی معاملات کا خاتمہ ہو جو اپنے معروضی اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربا کے مماثل و مشابہ ہیں اور جن میں ایک فریق کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی حکمت عملی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ربا اور ربوی معاملات کو قانوناً ممنوع ٹھہرائے اور بتدریج ان کا خاتمہ کرے۔

اسلامی ریاست کے اقتصادی پہلو کی تفصیل کے سلسلے میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے درمیان اشیاء ضرورت کا تبادلہ اور تجارتی لین دین ان کی آزاد مرضی سے ہو کسی مجبوری کے تحت نہ ہو، اور چونکہ ایسا صرف اس وقت اور اس صورت میں ہو سکتا ہے، جب وہ تبادلہ اور لین دین کے ان پیمانوں اور نرخوں کے مطابق ہو جو قدرتی حالات و عوامل کے زیر اثر طلب و رسد کے فطری طریقہ سے خود بخود وجود میں آتے ہیں اور عرف عام کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اسلام تبادلے اور تجارتی لین دین کے ان پیمانوں اور نرخوں کو درست و جائز تسلیم کرتا ہے جو قدرتی عوامل

کے زیر اثر طلب و رسد کے آزادانہ طریقہ سے وجود میں آتے ہیں اور عرف عام کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں' اور اس کے برعکس وہ ان پیمانوں اور نرخوں کو صحیح اور جائز نہیں تسلیم کرتا جو مصنوعی حالات کے تحت طلب و رسد کے فطری طریقہ سے وجود میں نہیں آتے اور نرخوں میں اضافے اور مہنگائی کا باعث بنتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے متعدد احادیث میں احتکار کی مذمت اور ممانعت آئی ہے۔ احتکار کا' جس کا ترجمہ ذخیرہ اندوزی کیا جاتا ہے' مطلب ہے اشیاء ضرورت کا اس ارادے سے ذخیرہ کر لینا اور بازار میں نہ آنے دینا کہ بازار میں مصنوعی قلت پیدا ہو' اور نرخ چڑھیں تو اس وقت مہنگے داموں فروخت کر کے زیادہ نفع کمایا جائے۔ احتکار کی طرح کا ایک اور طریقہ خاص قسم کی اشیاء ضرورت کی پیداوار اور خرید و فروخت پر خاص شخص یا خاص گروہ کی اجارہ داری کا طریقہ بھی ہے اس میں بھی بعض لوگوں کو اپنی مخصوص اشیاء اپنی مرضی کے مطابق نرخوں اور قیمتوں پر مہنگے داموں بیچنے اور دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ بعض احادیث میں تسعیر کی ممانعت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عام طبعی حالات میں جب کہ کچھ تاجر لوگ مصنوعی حالات پیدا کر کے اشیاء ضرودت کی قیمتوں اور نرخوں میں اضافہ نہ کر رہے ہوں تو حکومت کے لیے جائز نہیں ہوتا کہ وہ اپنی کسی مصلحت سے اشیاء ضرورت کے نرخ اور بھاؤ مقرر کرے اور لوگوں پر دباؤ ڈالے کہ وہ ان کے مطابق خرید و فروخت کریں۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کے بازار میں بعض اشیاء کے نرخ زیادہ بڑھ گئے (غالباً رسد میں کمی کی وجہ سے) کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپؐ مداخلت فرما کر نرخ کم کر دیجئے تو آپؐ نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ نرخ مقرر کرنے والا صرف اللہ ہے لوگوں کو اس میں آزاد چھوڑ دو' وہ جو چاہیں آپس میں طے کریں۔ اس حدیث میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ

ہی نرخ مقرر کرنے والا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جن قدرتی حالات کے تحت اور جن موسمی تغیرات کے زیر اثر' اشیاء ضرورت کی پیداوار میں کمی بیشی ہوتی اور ان کے نرخ گھٹتے بڑھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت و قدرت سے تعلق رکھتے اور اس کی مرضی سے وجود میں آتے ہیں۔ لہٰذا نرخ مقرر کرنے کی بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے منسوب ہونا حقیقت واقعہ کے عین مطابق اور بالکل صحیح و درست بات ہے۔

چنانچہ اسلامی حکومت کی معاشی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ریاست کے اندر تمام مصنوعی طریقوں پر پابندی لگائے اور ان کو سختی کے ساتھ ختم کرے' جن میں بعض لوگوں کو زیادہ نفع کمانے کی غرض سے اپنی مرضی کے مطابق قیمتیں بڑھانے اور مہنگائی پیدا کرنے کا موقع ملتا ہو کیونکہ اس کے بغیر ملک و معاشرے میں وہ معاشی توازن پیدا نہیں ہوسکتا جو اسلام چاہتا ہے اور جس سے افراد کے معاشی حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست کے اقتصادی پہلو کی توضیح کے سلسلے میں ایک اور چیز' جس کا ذکر ازبس ضروری ہے' یہ ہے کہ ریاست کے جو شہری کسی عذر مثلاً بچپن' بڑھاپے اور بیماری وغیرہ کی وجہ سے خود کوئی معاشی کام کرنے اور کمانے کے قابل نہ ہوں اور ان کے رشتہ داروں میں بھی کوئی ان کی معاشی کفالت کرنے والا نہ ہو اور وہ مسکین و محتاج ہوں تو ایسے شہریوں کی معاشی کفالت کی ذمہ داری' معاشرے اور حکومت پر عائد ہوتی ہے اور ان پر لازم ہے کہ وہ بیت المال سے ان کی معاشی کفالت کا بندوبست کریں۔

اسلامی ریاست کے اقتصادی اور معاشی پہلو سے متعلق اسلام کے حوالے سے جو اصولی باتیں بیان کی گئیں ہیں۔ اگر ان کا پوری طرح لحاظ رکھا اور ان پر صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے تو اس کے نتیجے میں اسلامی ریاست کے ہر شہری اور ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں بنیادی معاشی ضروریات بھی ہرحال

میں میسر آسکتی ہیں اور ہر ایک کو معاشی ترقی کا بھی مساوی اور مناسب موقع مل سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ریاست اور معاشرے میں ایک ایسا معتدل و متوازن معاشی ماحول وجود میں آسکتا ہے جس کے اندر ہر انسان کے لیے معاشی سکون و اطمینان کی پوری ضمانت موجود ہوتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "حجتہ اللہ البالغہ" میں تحریر فرمایا ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ تھا کہ اس غیر فطری اور ظالمانہ معاشی عدم توازن کو ختم کر دیا جائے جو اس وقت کے دو متمدن ممالک یعنی فارس اور روم میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ وقت آگیا ہے کہ مسلم معاشروں میں موجود غیر متوازن ظالمانہ معاشی نظام کو ختم کر کے ایک متوازن اور عادلانہ معاشی نظام قائم کیا جائے۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ دنیا کے بعض ملکوں نے ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنے کے لیے عملی طور پر کامیاب تجربے بھی کئے ہیں لیکن ہم ایک واضح، اور بلند نصب العین رکھنے کے باوجود اس میدان میں کوئی کامیاب قدم نہ اٹھا سکے، جس کی موجودہ حالات میں بے حد ضرورت ہے۔